© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

نظرات

۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم سے قبل عالمِ اسلام یورپ کے تابڑ توڑ حملوں کا نشانہ بنا ہوا تھا۔ اور وہ ان کی تاب نہ لاکر برابر پیچھے ہٹ رہا تھا۔ یہ جنگ جب ختم ہوئی تو مسلمانوں کے خلاف یورپی قوموں کی جارحیت اپنے پورے عروج کو پہنچ گئی۔ ترکوں کی عثمانی سلطنت جو دو سو سال سے اس جارحیت کا تھوڑا بہت مقابلہ کر رہی تھی، اس نے بھی شکست کھاکر ہتھیار ڈال دیئے اور برطانوی فوجیں اس کے دارالسلطنت استنبول پر قابض ہوگئیں۔

عالمِ اسلام جو صدیوں کے عروج و اقبال کے بعد کئی سو سال سے زوال پذیر تھا، جب نوجوان یورپی قومیں نئے جنگی ہتھیار، نئے فنِ حرب، نئے معاشی و اجتماعی نظام اور نئے افکار و تصوّرات کو لے کر اس پر حملہ آور ہوئیں، تو وہ ان کے مقابلے میں ٹھہر نہ سکا۔ وہ برابر پیچھے ہٹتا گیا۔ ایک مسلمان ملک کے بعد دوسرا مسلمان ملک یورپی سامراج کے زیرِ نگیں آیا اور آخر میں ۱۹۱۸ء میں جب پہلی جنگِ عظیم ختم ہوئی، تو یورپ کے مقابلے میں عالمِ اسلام کی پسپائی اپنے انتہائی نقطے پر پہنچ گئی۔ اور اس کا کوئی کونہ ایسا نہ رہا جو اگر براہ راست نہیں تو بالواسطہ یورپی سامراج کے تابع نہ ہو۔

یہ بڑا مایوسی کا دور تھا۔ جن لوگوں کو اس دور میں رہنے کا موقع ملا، اس کی المناک یادیں اب تک ان کے دلوں میں محفوظ ہیں۔ اسی زمانے میں علامہ اقبال مرحوم نے اپنی مشہور نظم "خضرِ راہ" لکھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب مرحوم انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں یہ نظم سنا رہے تھے، تو جہاں اس میں عالمِ اسلام کی عام تباہی و بربادی اور خاص کر کلائے لالہ رنگ کی زمانے میں رسوائی اور مسلمان کے خون کی ارزانی کا ذکر تھا۔ اسے سن کر پورا مجمع ایک آہ و بکا بن گیا۔ اور خود علامہ اقبال کی یہ حالت تھی کہ چند شعر پڑھ کر رکتے تاکہ اپنے آپ کو سنبھال سکیں۔

اس خونِ صد ہزار انجم سے آخر سحر بھی پیدا ہوئی۔ غازی مصطفیٰ کمال نے برطانیہ کی ایجنٹ طاقت یونان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی حملہ آور فوجوں کو جو یورپی ترکی کے علاوہ ایشیائی ترکی کے بچے کھچے حصے سے بھی اسلامی ترکی کے تسلط کو ختم کرنا چاہتی تھی، الفرہ کے پاس سقاریہ کے میدان جنگ میں شکست دی۔ پہلے ایشیائی ترکی کو حملہ آوروں سے پاک کیا گیا۔ پھر برطانوی فوجوں کو استنبول چھوڑنے پر مجبور کیا گیا۔ ترکی آزاد ہو گیا، اور ترکوں کی عثمانی سلطنت کے کھنڈرات پر ایک نئے ترکی۔ کمالی ترکی۔ کی عمارت کھڑی کرنے کی طرح ڈالی گئی۔

حملہ آور یورپ کے مقابلے میں مسلمان قومیں کوئی دو سو سال سے پیچھے ہٹ رہی تھیں۔ اور انہیں شکست پر شکست مل رہی تھی۔ سب سے پہلی بار سقاریہ کے میدان میں مسلمان فوجوں نے یورپی قوموں کی اس پیش قدمی کو روکا اور انہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کیا۔ یہاں سے دنیائے اسلام کا مدّ یعنی چڑھاؤ، جزر یعنی اتار کے بعد شروع ہوتا ہے۔ مصطفیٰ کمال کے بعد رضا شاہ پہلوی نے سرزمین ایران پر قابض برطانوی فوجوں کو نکالا۔ اور اسے آزاد کیا۔ پھر مصر میں آزادی کی جدوجہد شروع ہوئی اور سعد زغلول پاشا ایک حد تک انگریزوں کے عمل دخل سے اپنے ملک کو آزاد کرا سکے۔ اسی زمانے میں برّصغیر پاک و ہند اور انڈونیشیا میں آزادی کی تحریکیں اٹھیں، اور یہاں کے مسلمان عوام نے پہلی بار عوامی سطح پر غیر ملکی سامراجی طاقتوں سے جنگ لڑی۔ گو ان ملکوں کو بہت بعد میں آزادی ملی لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس آزادی کی بنیاد جنگ سقاریہ میں پڑی جہاں پہلی بار یورپ کو مشرق کے مقابلے میں پیچھے ہٹنا پڑا۔

یہ تو سب کچھ ہوا پہلی جنگِ عظیم کے بعد سے مسلمان ملک یکے بعد دیگرے یورپ کے سیاسی تسلط سے آزاد ہوتے گئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مسلمان ملکوں میں ان مادی ذرائع و وسائل اور ان علمی و تہذیبی افکار و آراء اور اداروں کو بھی بتدریج اپنانے کا عمل شروع ہو گیا۔ جو ان کے نزدیک یورپی قوموں کے طاقت ور بننے اور سربلند ہونے کا سبب تھے۔ جس طرح ترکی یورپ سے سیاسی و عسکری نبرد آزمائی میں سب سے آگے تھا۔ اور اسے سب سے پہلی شکست ترکی ہی نے دی تھی، اسی طرح یورپی نظامِ معاشرت اور اس کے تہذیبی اداروں کو بھی اپنانے میں بھی پہل اسی نے کی۔ یہ اچھا ہوا یا بُرا۔ یہ بحث دوسری ہے لیکن مصطفیٰ کمال کے زیر قیادت ایسا ہوا، اور اب یہ ایک تاریخی واقعہ ہے، جسے ہوئے چالیس سال سے زیادہ ہو گئے ہیں۔

مانا اس کے خلاف اب ترکی کے بعض حلقوں میں ردّعمل ہے۔ لیکن یہ صرف ردّعمل ہے۔ یہ گزشتہ چالیس سال کے تاریخی عمل کو ختم نہیں کر سکتا۔ یہ ردّعمل دراصل ان مفرطانہ بدعنوانیوں کے خلاف ہے، جن کا اس یورپین ازم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو اپنانے میں ارتکاب کیا گیا۔ اور جن کی اصلاح بہر حال ضروری تھی۔

علامہ اقبال نے اپنے انگریزی خطبات میں ترکوں کے اس تجربے پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ مرحوم نے اس کے بعض پہلوؤں کی تعریف کی ہے، اور اس میں جو بنیادی خامیاں ہیں، ان کی نشان دہی بھی کی ہے۔

علامہ فرماتے ہیں:۔ مسلمان قوموں میں قدامت پرستی کے خواب سے بیدار ہونے والوں میں ترک پیش پیش ہیں۔ وہ ایک خیالی دنیا سے نکل کر اب عالمِ حقیقت میں آ گئے ہیں۔ وہ ان اصولوں کی از سر نو تعبیر پر مجبور ہیں، جو اب خشک بحثوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ بلادِ اسلامیہ کا حال یہ ہے کہ ان کی اکثریت میں پرانی قدروں ہی کا تکرار جاری ہے۔ بعینہٖ جیسے کوئی مشین ایک ہی انداز پر چل رہی ہو۔ ترک البتہ نئی نئی قدریں پیدا کر رہے ہیں۔ ان کا گزر بڑے بڑے اہم تجربات سے ہو رہا ہے اور یہی تجربات ہیں جن سے ان کا اندرونِ ذات ان پر منکشف ہو رہا ہے۔ ان کی زندگی میں حرکت پیدا ہو گئی ہے۔ وہ بدل رہی اور وسعت حاصل کر رہی ہے۔ اس کا نتیجہ ہے نئی نئی آرزوئیں اور نئی نئی مشکلات۔ مگر پھر اس کے ساتھ ساتھ وہ ان کے نئے نئے حل بھی سجھا رہی ہے۔۔۔۔

اس ارشاد کے بعد مرحوم کہتے ہیں:۔

" آج جو مسئلہ ترکوں کو درپیش ہے، کل دوسرے بلادِ اسلامیہ کو پیش آنے والا ہے ۔۔۔"

ترکوں کے اس تجربے میں جو خطرات مضمر تھے، علامہ اقبال نے اسی وقت ان سے بھی متنبہ کر دیا تھا، وہ فرماتے ہیں:۔

بہر حال ہم اس تحریک کا جو حریت اور آزادی کے نام پر عالمِ اسلام میں پھیل رہی ہے، دل سے خیر مقدم کرتے ہیں لیکن یاد رکھنا چاہیئے، آزاد خیالی کی یہی تحریک اسلام کا نازک ترین لمحہ بھی ہے۔ آزاد خیالی کا رجحان بالعموم تفرقہ اور انتشار کی طرف ہوتا ہے۔ لہٰذا نسلیت اور قومیت کے یہی تصوّرات جو اس وقت دنیائے اسلام میں کارفرما ہیں، اس وسیع مطمحِ نظر کی نفی بھی کر سکتے ہیں، جن کی اسلام نے مسلمانوں کو تلقین کی ہے۔

پھر اس کے علاوہ یہ بھی خطرہ ہے کہ ہمارے مذہبی اور سیاسی رہنما حریت اور آزادی کے جوش میں، بشرطیکہ اس پر کوئی روک عائد نہ کی گئی۔ اصلاح کی جائز حدود سے تجاوز کر جائیں۔

اس ضمن میں علامہ اقبال نے چند نصیحتیں کی ہیں، جن کو مختصراً یہاں بیان کرنا بے محل نہ ہوگا۔

(۱) عالمِ اسلام کی قیادت کو چاہیئے کہ اپنے دل و دماغ پر قابو رکھتے ہوئے اوّل یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ بحیثیت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک نظامِ مدنیتِ اسلام کے مقاصد کیا ہیں اور پھر آگے قدم بڑھائیں۔

(۲) جیسے جیسے مسلمانوں میں زندگی کو تقویت پہنچے گی، اسلام کی عالمگیر روح فقہاء کی قدامت پسندی کے باوجود اپنا کام کر کے رہے گی۔ مجھے اس امر کا بھی یقین ہے کہ جونہی فقہِ اسلام کا مطالعہ غائر نگاہوں سے کیا گیا، اس کے موجودہ ناقدین کی یہ رائے بدل جائے گی کہ اسلامی قانون جامد یا مزید نشو و نما کے ناقابل ہے۔

(۳) قرآن مجید کا مطمحِ نظر جمود کے بجائے حرکت ہے۔ جس کتاب کا مطمحِ نظر ایسا ہوگا، اس کی روش ارتقا کے خلاف کیسے ہو سکتی ہے؟ البتہ ہمیں نہیں بھولنا چاہئے تو یہ کہ زندگی محض تغیر ہی نہیں۔ اس میں حفظ و ثبات کا ایک عنصر بھی موجود ہے۔۔۔۔۔ انسان ہر لحظہ آگے ہی آگے بڑھنے والی حرکت میں اپنے ماضی کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔۔۔۔ دوسرے لفظوں میں زندگی چونکہ ماضی کا بوجھ اٹھائے آگے بڑھتی ہے، اس لئے ہمیں چاہیئے جماعت میں تغیر و تبدل کا جو نقشہ ہم نے قائم کیا ہے، اس میں قدامت پسندانہ قوتوں کی قدر و قیمت اور وظائف فراموش نہ کریں۔۔۔۔۔

(۴) دنیا کی کوئی قوم اپنے ماضی سے قطعِ نظر نہیں کر سکتی۔ اس لئے کہ یہ ان کا ماضی ہی تھا۔ جس سے ان کی موجودہ شخصیت متعین ہوئی۔۔۔۔

(۵) مسلمانوں کا آزاد خیال طبقہ اگر اس امر کا دعوے دار ہے کہ اسے اپنے تجربات، علیٰ ھذا زندگی کے بدلتے ہوئے احوال و ظروف کے پیشِ نظر فقہ و قانون کے بنیادی اصولوں کی از سرِ نو تعبیر کا حق پہنچتا ہے تو میرے نزدیک اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو غلط ہو۔ قرآن پاک کا یہ ارشاد کہ زندگی ایک مسلسل تخلیقی عمل ہے بجائے خود اس امر کا مقتضی ہے کہ مسلمانوں کی ہر نسل اسلاف کی رہنمائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مسائل آپ حل کریں۔ یہ نہیں کہ اسے اپنے لئے ایک روک تصوّر کرے۔

ترکوں کے اس تجربے کے مالہٗ و ماعلیہ پر بحث کرنا اس وقت مطلوب نہیں۔ اور نہ ہم یہاں اس تفصیل میں جانا چاہتے ہیں کہ کہاں تک یہ کامیاب ہوا، اور کس حد تک ناکام۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس تجربے کے اثرات کہیں کم کہیں زیادہ سارے عالمِ اسلامی پر پڑے۔ اور ہر مسلم قوم نے اس کی روشنی میں اپنے آپ کو تھوڑا بہت بدلا دوسری جنگِ عظیم کے بعد کچھ اسی قسم کا تجربہ بعض دوسرے عرب ملکوں میں بھی ہو رہا ہے۔ ترکی نے تو اپنے دروازے مغربی یورپ اور بعد میں امریکہ کے تمدنی و فکری اثرات کے لئے کھولے تھے اور اپنی قومی شخصیت کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

برقرار رکھتے ہوئے ان اثرات کو بڑی خوش دلی سے قبول کیا تھا۔ اب چند عرب ملکوں نے آئینی لحاظ سے اشتراکیت کو اپنایا ہے۔ گو وہ اسے عرب اشتراکیت کا نام دیتے ہیں، لیکن وہ ہے اشتراکیت ہی۔ اس اشتراکیت کے ذیل میں معاشی و اجتماعی تنظیم کے سلسلے میں وہ خیالات اور ادارے ان ملکوں میں فروغ پا رہے ہیں جو کسی نہ کسی حد تک اشتراکی فکر و نظام سے مخصوص ہیں۔ ان ملکوں میں تمام عرب جمہوریتیں شامل ہیں یہاں تک کہ ٹیونس جو اشتراکی ملکوں سے بہت دُور اور مغربی ملکوں سے قریب ہے، اس کے ہاں بھی سرکاری طور پر اشتراکیت ہی نصبُ العین ہے۔

یہ اچھا ہے یا بُرا، یہاں ہمیں اس سے بحث نہیں، لیکن دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ یہ ہو رہا ہے اور مصر، الجزائر، شام، عراق، یمن اور جنوبی یمن میں اشتراکی خیالات پھیلائے جا رہے ہیں اور کسی نہ کسی شکل میں اشتراکی نظامِ معیشت کو اپنانے کی کوششیں جاری ہیں۔ مصر کے جمال عبد الناصر آئے دن اشتراکیت یعنی عرب اشتراکیت پر زور دیتے رہتے ہیں۔ اور تو اور جامعۂ ازہر کے ریکٹر شیخ حسن المامون کا ایک بیان ہماری نظر سے گزرا ہے، جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ عرب اشتراکیت اسلام کے منافی نہیں۔ اور جو لوگ عرب اشتراکیت کی مخالفت کرتے ہیں، وہ راہ راست سے ہٹ گئے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

مذکورہ بالا عرب جمہوریتوں کے اس مسلک کے خلاف وہ تمام عرب حکومتیں ہیں، جن میں بادشاہتیں ہیں۔ چنانچہ ان دونوں گروہوں میں برابر نظریاتی جنگ لڑی جا رہی ہے۔ اور اس کے متعلق کافی لٹریچر بھی شائع ہو رہا ہے۔ ان باہم متخاصم رجحانات کی چپقلش کا آگے چل کر کیا نتیجہ نکلتا ہے، اس کے بارے میں اس وقت کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن یہ یقینی ہے کہ اس اشتراکیت دوست اور اشتراکیت دشمن چپقلش کے عربوں کے ذہن اور ان کی عام زندگی پر دُور رس اثرات مترتب ہوں گے۔ ہمارے خیال میں عرب دنیا کو آج وہی تجربہ درپیش ہے، جو عباسی خلافت کے اوائل میں یونانی فلسفہ کے مقابلے میں درپیش تھا۔ بس فرق صرف اتنا ہے کہ اُس وقت عرب اپنے پورے عروج پر تھے، اور آج اسرائیل جیسی چھوٹی حکومت ان کے لئے ایک عظیم خطرہ بنی ہوئی ہے۔

ترکی میں جو کچھ ہوا، اور اب اکثر عرب ملکوں میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ ہمارے سامنے ہے۔ یہ ہماری نہ منزل ہو سکتی ہے اور نہ نشانِ منزل۔ گزشتہ دو سو سال سے برّصغیر پاک و ہند کی اسلامی زندگی جن راہوں پر گامزن ہے، اور ہمارے ہاں مسلمانوں کی اصلاح اور اسلام کے احیاء کی جو مسلسل تاریخ رہی ہے، وہ ترکی اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عرب ملکوں سے کافی حد تک مختلف ہے۔ اس کے اگر ہمیں کچھ نقصانات ہیں تو بہت سے فائدے بھی ہیں۔ عرب دنیا اور ترکی کے مقابلے میں ہمیں سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ برصغیر ایک تو صلیبی حملہ آوروں کی غارتگری سے محفوظ رہا۔ اور دوسرے تاتاری سیلاب جس نے ہرات، نیشاپور اور بلخ سے لے کر دمشق تک کے تمام علاقوں کو آگ اور خون میں ڈبو دیا تھا، دریائے اٹک سے اُدھر ہی رک گیا۔ اور اس کی وجہ سے ہمارے ہاں انگریزی تسلط تک علمی و فکری روایات کا تسلسل کسی نہ کسی شکل میں قائم رہا، بلکہ جب اس سرزمین سے ہمارے سیاسی اقتدار کا چراغ گُل ہونے والا تھا، اس وقت بھی ہمارے ہاں علمی زندگی میں اچھی خاصی قوت و توانائی تھی۔ چنانچہ اسی کے نمائندے سرسیّد، مولانا محمد قاسم، ذکاء اللہ، محمد حسین آزاد، حالی اور شبلی وغیرہ تھے، جن کی دینی و ادبی کوششوں سے انگریزی تسلط کے بعد ہمارے ہاں نئی بیداری کی طرح پڑی، اسی نے آگے چل کر اگر ایک طرف "علی گڑھ" یعنی نئی تعلیم کے مکتب علم و فکر کو جنم دیا، تو دوسری طرف دارالعلوم دیوبند وجود میں آیا۔ تقریباً ایک صدی سے یہ دونوں تعلیمی و علمی دھارے برابر آگے بڑھ رہے ہیں۔ اور اس دوران میں ان سے برّصغیر کے بے شمار لوگ سیراب ہوئے ہیں۔ اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا ہے کہ جہاں ہمارے ہاں قدیم دینی علوم معہ اپنی تمام روایات کے محفوظ رہے اور ان کا دائرہ نشر و اشاعت وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا، وہاں ہم نے جدید علوم اور سائنسوں سے بھی پورا استفادہ کیا۔ پھر جب پاکستان بنا، تو ہمارے ہاں صنعت و تجارت کو بھی فروغ ہوا اور ٹیکنالوجی کو عام کرنے کی کوشش کی گئی۔ غرض یہاں قدیم بھی ہے، جدید بھی اور جدید تر یعنی ٹیکنالوجی بھی، جس کا عمل دخل صنعتوں کے روز افزوں قیام کے ساتھ ساتھ برابر بڑھ رہا ہے اور اس سے ہماری معاشرت بھی متاثر ہو رہی ہے اور معیشت بھی۔ ضرورت اس کی ہے کہ قدیم و جدید میں ذہنی و عملی ہم آہنگی پیدا کر کے پاکستانی اسلامی فکر کو اس قابل بنایا جائے کہ ٹیکنالوجی سے ہماری زندگی میں جو بنیادی اور وسیع تبدیلیاں آئیں گی، وہ ہمارے ہاں ذہنی خلفشار اور عملی بے راہ روی کا موجب نہ بن سکیں۔ بے شک یہ کام بڑا مشکل ہے۔ لیکن ہے یہ بے حد ضروری، اور اسے تکمیل کرنے کے ہمارے ہاں دوسرے مسلمان ملکوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ حالات سازگار ہیں۔

اس قسم کے کاموں کے لئے دو باتیں بڑی ضروری ہوتی ہیں۔ ایک تو بیک وقت قدیم و جدید پر نظر رہے اور دونوں کی ایک سی اہمیت تسلیم کی جائے۔ یہ نہ ہو کہ ایک کو دوسرے پر اتنی ترجیح حاصل ہو جائے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ ان میں باہم توازن قائم نہ رہے۔ دوسری بات یہ کہ قدیم وجدید کو ہم آہنگ کر کے ملک وملت کے نئے حالات اور نئی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے جو طریقے وضع ہوں، ان میں تدریج واعتدال کا خاص خیال رکھا جائے۔ بے شک فکر کی رفتار تیز ہو سکتی ہے۔ آپ فکر میں صدیوں پہلے اور صدیوں بعد کے زمانے میں پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن عملی اقدامات کے لئے درجہ بدرجہ اور بالتدریج قدم اٹھانے پڑتے ہیں اور اس میں اعتدال لازمی ہے۔ یوں بھی عمل متحقق ہوتا ہے فکر اور حالات گردوپیش میں مفاہمت (COMPROMISE) سے، اور مفاہمت نام ہی تدریج اور اعتدال کا ہے۔

ہمارے ہاں صنعتیں بڑی سرعت سے پھیل رہی ہیں۔ اور یہ عمل وقت کے ساتھ ساتھ تیز سے تیز تر ہوتا جائے گا۔ صنعتوں کی وجہ سے سائنسی اور ٹیکنیکی فکر ترقی کرے گا۔ اور تعلیم عام ہوگی۔ اس کا لازماً اثر معیشت اور معاشرت پر پڑے گا جس کی وجہ سے قدرتاً ہمارا رہن سہن بدلے گا، اور اس کے ساتھ ہی اندازِ نظر وفکر بھی بدلے گا۔ اب اگر قدیم علوم، قدیم طرزِ زندگی، اور قدیم فکر ونظر کا دھارا اور نئے علوم اور نئے اندازِ زندگی کا دھارا اسی طرح الگ الگ بہتا رہا، تو اس سے قوم دو متخالف ومتخاصم گروہوں میں مستقل طور سے بٹ جائے گی۔ اور یہ نہ قوم کو جذباتی وذہنی طور سے ایک بننے دے گا اور نہ عملی لحاظ سے ہی۔ ان دھاروں کو کہیں تو ایک دوسرے سے قریب لانا چاہیئے۔ علامہ اقبال نے ایک زمانے میں لکھا تھا کہ قوموں کی زندگی میں سب سے کٹھن منزل ہوتی ہے۔ آئینِ نو سے ڈرنا اور طرزِ کہن پر اڑنا ہمیں اس کٹھن منزل کو اب سر کرنا ہے۔ قدیم جدید کے لئے ایک بہت بڑی قوت ہے۔ اگر جدید اسے اپنا دشمن نہ سمجھے۔ اسی طرح جدید قدیم کو نئی زندگی دے سکتا اور اسے زمانے کے ساتھ قدم بڑھا کر چلنا سکھا سکتا ہے، اگر قدیم جدید کو اپنی بقا کے لئے ضروری سمجھے۔ قدیم وجدید کا ملاپ ہمیشہ کی طرح آج بھی وقت کی اہم ضرورت ہے۔

جیسا کہ اخبارات میں آچکا ہے، ادارۂ تحقیقات اسلامی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر فضل الرحمٰن ۵ ستمبر ۱۹۶۸ء کو اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔ اور ان کا استعفیٰ منظور کر لیا گیا۔ اب ڈاکٹر صاحب موصوف کا ادارہ سے کوئی تعلق نہیں رہا۔

© rasailojaraid.com